محمد حنیف ندوی

تاثرات

ہمارے ادارہ میں کبھی کبھی ایسی مجلسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ جس میں لاہور کے وہ تمام حضرات جمع ہوکر کسی خاص علمی و ثقافتی موضوع پر اظہار خیال کریں، جنہیں ادب و فکر اور علم و فن سے فطری لگاؤ ہے اور جو تنقید یا جانچ پرکھ کے جدید اصولوں سے واقف ہیں۔ اس اجتماع سے دو قسم کے مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو اہل علم و ادب ایک دوسرے سے وابستہ اور متعارف رہتے ہیں، دوسرے تبادلۂ خیالات سے افکار و خیالات میں یگانگت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔

ابکی زبان کے مسئلہ کو ایسے ہی ایک اجتماع میں غور و فکر کا ہدف ٹھہرایا گیا۔ اور جناب مسعود صاحب سیکرٹری بجالیات کو زحمت دی گئی کہ وہ اس سلسلہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش فرمائیں۔ اور اس کے بعد معقول اور مناسب انداز میں اس نقطۂ نظر کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے نہایت جچے تلے انداز میں تقریر شروع کی اور قریب قریب پون گھنٹہ تک بولتے رہے۔ اس تقریر میں توازن، منطقی اعتدال اور استدلال سبھی کچھ تھا۔ اُنہوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ چند الفاظ میں یہ تھا کہ زبانیں کبھی قوموں پر ٹھونسی نہیں جاتیں بلکہ قدرتی طور پر خود بخود پیدا ہوتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ اس نکتہ پر اُنہوں نے خاص طور پر زور دیا۔ کہ ہر قوم میں لکھنے اور بولنے کی ایک ہی زبان ہوتی ہے۔ اسی میں اس کے روزمرہ اور محاورات ڈھلتے ہیں۔ اسی میں علمی و ادبی مرقعے تیار ہوتے ہیں۔ اور کوئی قوم بھی دو دو زبانوں میں بولنے اور لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتی۔ اگر عارضی طور پر کسی قوم نے سیاسی یا مذہبی تقاضوں کے پیش نظر کبھی دوسری زبانوں کو اپنا بھی لیا تو آخر میں اس کو مجبور ہونا پڑا کہ اس کو چھوڑ دے، اور اپنی اصلی زبان ہی کو پروان چڑھائے اور اظہار خیالات کا ذریعہ ٹھہرائے۔ اس کے ثبوت میں اُنہوں نے مغربی ممالک کو پیش کیا کہ کس طرح صدیوں تک ان پر لاطینی کا سحر طاری رہا۔ اور یہ قومیں اس فریب میں مبتلا رہیں کہ علمی مطالب کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ ثقہ اور بہتر سانچہ مہیا نہیں ہوسکتا۔ لیکن جونہی ان میں قومی شعور پیدا ہوا اور حقیقی تعلیمی ضرورتوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تو انہیں احساس ہوا کہ لاطینی سے کام چلنے والا نہیں۔ ہمیں اپنی ملکی و وطنی زبانوں کو فروغ دینا چاہیئے اور انہیں اس قابل بنانا چاہیئے کہ ان سے اشاعت علوم کا کام لیا جاسکے۔ چنانچہ

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے یہ زبانیں جن کا دامن علوم وفنون سے بالکل تہی تھا مالا مال ہوگئیں۔ اور آج ان کی کامیابیوں کا یہ عالم ہے کہ علم وہنر کی کوئی شاخ ایسی نہیں کہ جس کے متعلق ان میں کتابوں کا انبار موجود نہ ہو۔ اُنہوں نے تفصیل سے مسئلہ کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی کہ زبان اور معاشرہ میں چولی دامن کا رشتہ ہوتا ہے اس لئے اگر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ سندھی ایک معاشرہ رکھتے ہیں اور پنجابی یا پشتو زبان بولنے والے بھی ایک مخصوص ماحول میں رہتے ہیں، تو ان کو اجازت دینا چاہیئے کہ یہ اپنی اپنی علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیں۔ اُنہوں نے کہا کہ یہی تعلیمی نقطۂ نظر سے درست بھی ہے۔ ایک پنجابی یا سندھی طالب علم جتنی آسانی سے اپنی زبان میں مفہوم ونشا کو براہِ راست سمجھ سکتا ہے کسی دوسری زبان کے ذریعہ ایسا ہونا ممکن نہیں انہوں نے لسانیات کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار بھی کیا کہ ہر زبان کچھ صوتی خصوصیات رکھتی ہے جو انہیں لوگوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں جو اُسے بولتے ہیں۔ اور کوئی دوسری قوم اگر ان کو اختیار کرنا چاہے گی تو اس کو اچھا خاصا تکلف کرنا پڑے گا۔ اور گلے یا حنجرہ کے مزاج کو بدلے بغیر ان پر پوری طرح قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ اُنہوں نے اس کے ثبوت میں یہ کہا کہ ایک پشتو بولنے والا مثلاً اردو لب ولہجہ کی نزاکتوں کا قدرتاً خیال نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ دونوں کی تہذیبی فضائیں مختلف ہیں۔ اسی طرح ایک پنجابی جب اُردو میں بات چیت کرے گا تو اس کے گلے اور منہ کا سارا عضوی ڈھانچہ اس کی مخالفت کرے گا۔

ان کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ ذریعۂ تعلیم کی حد تک ہمیں پنجابی، سندھی اور پشتو کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے۔ اور اگر ممکن ہو تو مغربی پاکستان میں ان میں سے کسی ایک زبان کو قومی زبان مان لینا چاہیئے۔ اور پھر اس میں لکھنا اور بولنا چاہیئے۔ تاکہ یہ دوئی اور تفریق دور ہو کہ ہم بولتے تو کسی زبان میں ہیں اور لکھتے کسی دوسری زبان میں ہیں۔ اُردو کو اپنانے پر ان کو اس بناء پر اعتراض تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد کسی علاقے یا جغرافیائی حلقے میں یہ بولی نہیں جاتی۔ ذاتی طور پر اُنہوں نے یقین دلایا کہ وہ اُردو سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر جب لسانیاتی اور تعلیمی آسانیوں کے پہلو پر غور کیا جائے گا۔ تو لامحالہ کہنا پڑے گا کہ علاقائی زبانوں کو اختیار کرنا ہی زیادہ موزوں ہے۔

جن لوگوں نے اس بحث میں حصّہ لیا ان میں میاں افضل حسین صاحب وی۔ سی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔ مولانا عبدالمجید صاحب سالکؔ اور ڈاکٹر باقر صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

خلیفہ صاحب نے کہا کہ عام بول چال کی حد تک مسعود صاحب کے خیالات صحیح ہیں۔ لیکن جب نسبتہً زیادہ وسیع دائروں میں قدم رکھیں گے اور یہ دیکھنا چاہیں گے کہ کس زبان میں ہمارے واردات فکری کی زیادہ ترجمانی ہو جاتی ہے، کس زبان میں ہمارا تہذیبی سرمایہ محفوظ ہے، اور کون زبان ہمارے ملی ربط وضبط کو

قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تو اُردو کے سوا اور کوئی متبادل زبان اس کی جگہ نہیں لے سکیگی۔ ہمارے تصوّف، ہمارے فلسفہ اور ہمارے دینی و ثقافتی ادب کے شاہکار اسی میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہی وہ بولی ہے جس کو غالبؔ سرسیدؔ، حالیؔ، شبلی اور اقبال ایسی شخصیتوں نے اظہارِ خیال کے لئے چُنا۔ اس میں ہمارے ذہین ترین افراد کی کاوشوں کا بہترین حصّہ ہے۔ اور پھر یہ ایک زبان ہی نہیں، بلکہ یہ ایک اندازِ فکر بھی ہے، جس نے کہ ایک خاص تہذیب اور ایک خاص شائستگی کو جنم دیا ہے۔ یہی نہیں یہ ہماری تاریخ بھی ہے۔ اس سے اگر ہم چاہیں تو اپنے عروج و زوال کے ان تمام ادوار کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ جن سے ہم گذشتہ ڈیڑھ دو صدی میں دوچار ہوئے۔ چنانچہ اب اگر ہم اسے چھوڑ کر کسی علاقائی زبان کو اپنی قومی زبان ٹھہرائیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم ماضی کے اس عظیم ورثے سے دست کش ہو جائیں، اور ان تمام کوششوں کو ملیامیٹ کر دیں کہ جن کی وجہ سے ہم اس لائق ہوئے ہیں کہ زمانہ کے ارتقائی تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ خلیفہ صاحب نے اس حقیقت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا کہ اُردو موجودہ علوم و فنون کی پیچیدہ مصطلحات کو اپنے قالب میں ڈھالنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے اور لوگ جو اس کی بے مائگی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں وہ خود بے مایہ ہیں۔

اُنہوں نے کہا کہ ہماری علاقائی زبانیں ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہیں۔ اور ان کو ترقی کے اس فراز تک پہنچنے میں کہ جہاں اس وقت اُردو ممکن ہے ایک عرصہ چاہیئے۔ تو کیا جب تک یہ زبانیں ترقی نہیں کر پاتیں ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اور خیالات و افکار کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ نہ چلیں اور کیا ہم تہذیب و تمدّن کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو روک سکتے ہیں۔ اور زمانہ کی برق رفتاریوں سے بچھڑ کر زندہ رہ سکتے ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات کہ زبان کے سلسلہ میں جن کی اہمیّت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

سالک صاحب نے مسئلہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالی کہ لب و لہجہ کی دُشواری اور محاورہ کی پابندی سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اُنہوں نے کہا کہ اُردو پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ ہمارے ہاں علم و ادب کے ایسے ایسے فاضل پیدا ہوئے ہیں کہ جنہوں نے اہلِ زبان سے زبان دانی کی داد پائی ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اور ان کی خدمات ایسی گرانمایہ ہیں کہ رہتی دنیا تک ان سے استفادہ کا عمل جاری رہے گا۔

اُنہوں نے علاقائی زبانوں کے بارہ میں اس اشکال کا ذکر کیا کہ وہ آپس میں اس درجہ مختلف ہیں کہ کسی کے لئے بھی ایک دوسرے کی زبان کو اپنا لینا آسان نہیں۔ مثلاً بلوچی، پشتو اور سندھی ہم پنجابیوں کے لئے بالکل ناقابلِ فہم ہیں۔ اور ان کے تلفظ پر ہمیں مطلق قدرت نہیں۔ اور ان کی نسبت اُردو بہرحال بہت ہی سہل اور آسان ہے۔ یہی حال پنجابی کا ہے۔ اسے اگر قومی زبان کی حیثیت دی جائے تو سندھی،

اور بلوچی یا پشتو بولنے والوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اور کسی طرح بھی یہ زبان مشترکہ اور قومی زبان کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ علاوہ ازیں اس طرح علاقائی تعصّبات اُٹھ کھڑے ہونگے اور ملک کا ہر ہر حصّہ یہ چاہے گا کہ اسی کی زبان کو ملکی زبان کا اعزاز بخشا جائے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انتشار اور گڑبڑ کا وہ طوفان برپا ہوگا کہ سنبھالے نہیں سنبھل پائے گا۔

سالک صاحب نے محاورات سے متعلق تنگ نظری کی مذمت کی۔ اور یہ کہا کہ اہلِ زبان کو اس معاملہ میں تشدّد نہیں برتنا چاہیئے۔ کیونکہ اب اس کے دائرے بہت پھیل گئے۔ اور یہ صرف غزل و شعر کی محدود زبان نہیں رہی۔ بلکہ سنجیدہ علمی مطالب کے اظہار کا بھی وسیع ترین رابطہ ہے۔ لہٰذا اس کو اگر تمام ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو چلنا ہے تو دلی اور لکھنؤ کے نقطۂ نظر کی پیروی کو یکسر ترک کرنا پڑیگا۔ اور صرف یہ دیکھنا پڑے گا کہ ایک ادیب یا مصنّف جن خیالات و افکار کو بیان کرنا چاہتا ہے اس میں وہ کامیاب ہے یا نہیں۔ اور پڑھنے والے کے ذہن میں اُس نے کوئی کیفیت پیدا کی ہے یا نہیں۔ اگر اس کی تحریر میں ذوقِ سلیم کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اس نے اپنے قارئین کو متاثر کیا ہے تو یہ بہت ہے۔

لب و لہجہ کی دُشواریوں پر گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ مسعود صاحب کا اعتراض صحیح ہے۔ لیکن اگر لکھنؤ اور بہار کے لب و لہجہ میں اختلاف ہوسکتا ہے، اور دلی اور دکن کا فرق مستند ہے، تو اس میں مغربی پاکستان کو بھی شامل کر لیجئے۔

میاں افضل حسین صاحب وائس چانسلر اور ڈاکٹر باقر صاحب نے بھی لسانیات کے بعض عقدوں کو سلجھایا، اور اس سلسلہ میں نہایت ہی مفید نکات کی طرف توجہ دلائی۔ اور بالآخر یہ دلچسپ صحبت کوئی دو گھنٹے جاری رہ کر اختتام پذیر ہوئی۔